جلد01شمارہ19، 2026

Article

A Study of Marginalized Characters in Urdu Fiction in the Perspective of Subaltern Studies

سبالٹرن سٹڈیز کے تناظر میں اردو فکشن میں حاشیائی کرداروں کا مطالعہ

Muhammad Akram Shad*[1], Dr. Kanwar Zafar Iqbal[2]

[1]Ph.D Research Scholar,[2]Assistant Professor, Department of Urdu, The Imperial College of Business Studies, Lahore

محمد اکرم شاد[1]، ڈاکٹر کنور ظفر اقبال

[1]پی ایچ۔ڈی اسکالر، [2]اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، دی امپیریل کالج آف بزنس اسٹڈیز، لاہور

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license
Copyright: © 2025 by the authors.

Abstract:

This research explores the representation of marginalized characters in Urdu fiction through the theoretical framework of Subaltern Studies. The study aims to examine how Urdu fiction reflects the voices, experiences, struggles, and resistance of socially, politically, culturally, and economically oppressed groups that remain excluded from dominant historical and literary narratives. Subaltern Studies, developed primarily by Ranajit Guha and later expanded by Gayatri Chakravorty Spivak and other postcolonial theorists, focuses on those communities whose identities and experiences are suppressed by structures of power and authority.

Urdu fiction, particularly the modern short story and novel, provides a rich space for the portrayal of marginalized individuals such as peasants, laborers, women, migrants, lower classes, religious minorities, and other socially excluded communities. This study analyzes selected fictional works of prominent Urdu writers including Saadat Hasan Manto, Ismat Chughtai, Abdullah Hussain, Intizar Hussain, and Khadija Mastur to investigate how subaltern consciousness is represented in their narratives. The research also examines the relationship between power, language, identity, and resistance within literary discourse.

The paper argues that Urdu fiction not only depicts the sufferings of marginalized groups but also presents their hidden forms of resistance, agency, and struggle for identity. Through realistic, symbolic, and psychological techniques, Urdu writers challenge dominant ideologies and expose social inequalities embedded within society. The study further highlights how fiction becomes an alternative historical document that records the voices often ignored by official history and elite-centered narratives.

This research concludes that Subaltern Studies offers an important critical approach for understanding the deeper socio-political dimensions of Urdu fiction. It also establishes that Urdu literature serves as a powerful medium for articulating the realities of marginalized communities and questioning systems of oppression and exclusion.

Keywords:
Subaltern Studies, Urdu Fiction, Marginalized Characters, Postcolonial Literature, Resistance, Identity

اکیسویں صدی کے فکری، ادبی اور تاریخی مباحث میں سبالٹرن اسٹڈیز ایک ایسے تنقیدی اور علمی رجحان کے طور پر سامنے آئی ہے جس نے تاریخ نویسی، علمیات اور سماجی علوم کے مروجہ اصولوں کو نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھا۔ اس تحریک نے اس بنیادی سوال کو مرکزیت دی کہ تاریخ کس کی لکھی جاتی ہے اور کن طبقات کی آوازیں شعوری یا غیر شعوری طور پر خاموش کر دی جاتی ہیں۔ روایتی تاریخ نویسی میں ہمیشہ حکمران طبقات، نوآبادیاتی قوتوں، سیاسی اشرافیہ اور مقتدر اداروں کو مرکزیت حاصل رہی، جبکہ کسانوں، مزدوروں، عورتوں، قبائلی گروہوں اور دیگر محکوم طبقات کے تجربات، جدوجہد اور مزاحمت کو یا تو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا یا انہیں محض پس منظر کا حصہ سمجھا گیا۔ سبالٹرن اسٹڈیز نے اسی تاریخی خاموشی کو توڑنے اور حاشیے پر موجود طبقات کو مرکزیت دینے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریک صرف تاریخ نویسی کی ایک نئ جہت نہیں بلکہ طاقت، علم اور نمائندگی کے پورے نظام پر ایک گہری تنقید بھی ہے۔

لفظ ”Subaltern“ اپنی اصل میں لاطینی زبان کے لفظ subalternus سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ”کم درجے کا“، ”ذیلی“ یا ”ماتحت“ کے ہیں۔ ابتدا میں یہ اصطلاح عسکری تناظر میں استعمال ہوتی تھی، لیکن اطالوی مارکسی مفکر انتونیو گرامشی نے اسے ایک وسیع سماجی اور سیاسی مفہوم عطا کیا۔ گرامشی کے نزدیک سبالٹرن طبقات وہ گروہ ہیں جو سماجی، سیاسی اور ثقافتی طاقت کے ڈھانچوں سے باہر رکھے جاتے ہیں اور جن کی آواز کو مرکزی بیانیے میں جگہ نہیں ملتی۔ گرامشی نے اپنی مشہور تصنیف Selections from the Prison Notebooks میں طاقت اور ثقافتی بالادستی کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے لکھا:

"The supremacy of a social group manifests itself in two ways, as 'domination' and as 'intellectual and moral leadership."(1)

گرامشی کے اس تصور نے سبالٹرن اسٹڈیز کی فکری بنیاد فراہم کی۔ ان کے مطابق طاقت صرف سیاسی یا عسکری جبر کے ذریعے قائم نہیں رہتی بلکہ ثقافتی بالادستی، فکری قیادت اور سماجی عادات کے ذریعے بھی اپنی گرفت مضبوط رکھتی ہے۔ جب محکوم طبقات طاقتور طبقے کے نظریات، زبان اور اقدار کو "فطری" سمجھنے لگتے ہیں تو دراصل طاقت اپنی سب سے مضبوط شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہی تصور بعد میں نوآبادیاتی معاشروں کے مطالعے میں نہایت اہم ثابت ہوا، کیونکہ استعماری قوتوں نے صرف سیاسی اقتدار قائم نہیں کیا بلکہ مقامی شعور، علم اور ثقافت کو بھی اپنے بیانیے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔

سبالٹرن اسٹڈیز کی باقاعدہ تشکیل 1980 کی دہائی میں جنوبی ایشیائی مورخین کے ایک گروہ نے کی، جس کے روحِ رواں رنجیت گوہا تھے۔ گوہا نے محسوس کیا کہ ہندوستانی تاریخ نویسی بنیادی طور پر دو بڑے رجحانات کے زیرِ اثر رہی: ایک نوآبادیاتی تاریخ نویسی، جس میں برطانوی سامراج کو تاریخ کا مرکزی کردار بنایا گیا؛ اور دوسری قوم پرستانہ تاریخ نویسی، جس میں قومی رہنماؤں اور اشرافیہ کو ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا۔ دونوں صورتوں میں عوامی طبقات، کسانوں، مزدوروں اور مقامی مزاحمتوں کے کردار کو نظر انداز کیا گیا۔ گوہا نے اسی مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

"The historiography of Indian nationalism has for a long time been dominated by elitism colonialist elitism and bourgeois-nationalist elitism."(2)

گوہا کے نزدیک قوم پرستی کی تاریخ دراصل اشرافیہ کی تاریخ بن کر رہ گئی تھی جبکہ عوامی طبقات کی اپنی ایک خودمختار سیاسی روایت موجود تھی۔ وہ اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ عوامی سیاست کو صرف اشرافیہ کی سیاست کے ردِعمل کے طور پر نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اس کی اپنی منطق، زبان اور مزاحمت کی شکلیں ہوتی ہیں۔ اسی لیے وہ لکھتے ہیں:

"The politics of the people was autonomous, independent of the politics of the elite, both colonial and nationalist."(3)

یہ جملہ سبالٹرن اسٹڈیز کے بنیادی فکری اصول کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ اس کے ذریعے پہلی بار عوامی سیاست کو ایک خود مختار تاریخی قوت کے طور پر تسلیم کیا گیا۔

رنجیت گوہا کی کتاب Elementary Aspects of Peasant Insurgency in Colonial India سبالٹرن اسٹڈیز کے فکری ارتقا میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ہندوستانی کسان بغاوتوں کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ ان تحریکوں کو محض جذباتی ردِ عمل یا غیر منظم عوامی ہجوم قرار دینا غلط ہے۔ ان کے مطابق کسانوں کی مزاحمت ایک منظم اخلاقی اور سیاسی شعور کی حامل تھی۔ گوہا لکھتے ہیں:

"Peasant insurgency was never simply a spontaneous outburst of anger; it was structured by shared notions of justice, morality, and legitimacy."(4)

گوہا کے مطابق کسان بغاوتوں کے پیچھے انصاف، اخلاقیات اور سیاسی شعور کے واضح تصورات کارفرما تھے۔ اس نقطۂ نظر نے روایتی تاریخ نویسی کے اس دعوے کو رد کر دیا کہ عوامی مزاحمت ہمیشہ غیر شعوری یا غیر سیاسی ہوتی ہے۔ سبالٹرن اسٹڈیز نے اس کے برعکس یہ ثابت کیا کہ محکوم طبقات اپنی مزاحمت کی الگ زبان، منطق اور تاریخی شعور رکھتے ہیں۔

سبالٹرن اسٹڈیز کی اہمیت اس وقت مزید بڑھ گئی جب اسے مابعد نوآبادیاتی تھیوری کے ساتھ جوڑا گیا۔ ایڈورڈ سعید کی معروف کتاب Orientalism نے اس فکری بحث کو ایک نئی سمت دی۔ سعید نے استدلال کیا کہ مغرب نے "مشرق" کو ایک تخیلاتی اور استعماری تصور کے طور پر تشکیل دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"The Orient was almost a European invention."(5)

ایڈورڈ سعید یہ واضح کرتے ہیں کہ "مشرق" کوئی معروضی حقیقت نہیں تھا بلکہ مغربی علم اور طاقت کی پیداوار تھا۔ مغربی استعماری قوتوں نے مشرق کو "غیر مہذب"، "غیر عقلی" اور "پسماندہ" قرار دے کر اپنی سیاسی اور ثقافتی بالادستی کو جواز فراہم کیا۔ سعید کے مطابق علم اور طاقت ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ باہم مربوط ہیں۔ یہی تصور سبالٹرن اسٹڈیز کے لیے بھی نہایت اہم ثابت ہوا کیونکہ اس نے واضح کیا کہ تاریخ اور علم کبھی غیر جانب دار نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ طاقت کے ڈھانچوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔

گیاتری چکرورتی اسپیوک نے سبالٹرن اسٹڈیز کو مزید تنقیدی جہت عطا کی۔ ان کا مشہور مضمون Can the Subaltern Speak? اس میدان کی اہم ترین تحریروں میں شمار ہوتا ہے۔ اسپیوک کے مطابق سبالٹرن محض ایک محکوم طبقہ نہیں بلکہ ایک ایسا "ساختیاتی مقام" ہے جہاں سے اس کی آواز سنائی ہی نہیں دیتی۔ وہ لکھتی ہیں:

"The subaltern cannot speak."(6)

اسپیوک کے اس جملے نے علمی دنیا میں ایک وسیع بحث کو جنم دیا۔ ان کے مطابق جب دانشور یا سیاسی ادارے سبالٹرن کی نمائندگی کرتے ہیں تو دراصل وہ اپنی زبان اور اپنے نظریاتی سانچوں کے ذریعے اس کی اصل آواز کو دوبارہ خاموش کر دیتے ہیں۔ اسپیوک نے "epistemic violence" یعنی "علمیاتی تشدد" کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ وہی علمی ڈھانچے جو سبالٹرن کو "جاننے" اور "بیان" کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، دراصل اس کی شناخت اور تجربے کو مسخ کر دیتے ہیں۔

اسپیوک کی فکر خاص طور پر عورت کے سبالٹرن تجربے پر مرکوز ہے۔ ان کے مطابق عورت نہ صرف نوآبادیاتی طاقت کے جبر کا شکار ہوتی ہے بلکہ پدرشاہی نظام بھی اس کی آواز کو دبا دیتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> "If, in the context of colonial production, the subaltern has no history and cannot speak, the subaltern as female is even more deeply in shadow."(7)

یہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ عورت کا تجربہ سبالٹرن کے اندر بھی زیادہ پیچیدہ اور دباؤ کا شکار ہے۔ اسپیوک کے مطابق عورت دوہری خاموشی کا شکار ہے: ایک نوآبادیاتی جبر کی وجہ سے اور دوسری پدرشاہی ڈھانچے کی وجہ سے۔

دیپیش چکرورتی نے سبالٹرن اسٹڈیز کو جدیدیت اور تاریخ کے سوالات سے جوڑا۔ ان کی کتاب Provincializing Europe: Postcolonial Thought and Historical Difference مابعد نوآبادیاتی فکر میں ایک بنیادی متن کی حیثیت رکھتی ہے۔ چکرورتی کے مطابق یورپ کو تاریخ اور جدیدیت کا واحد مرکز سمجھنا استعماری رویہ ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> "To provincialize Europe is not to reject it, but to open up the possibility of thinking from elsewhere."(8)

اس جملے میں چکرورتی اس امر پر زور دیتے ہیں کہ جدیدیت کو صرف مغربی تجربے سے وابستہ کرنا غلط ہے۔ غیر مغربی معاشروں کی اپنی تاریخی جدیدیتیں اور ثقافتی تجربات موجود ہیں، جنہیں مغربی مرکزیت کے بغیر بھی سمجھا جاسکتا ہے۔

سبالٹرن اسٹڈیز نے تاریخ نویسی کے ماخذ کو بھی وسعت دی۔ روایتی تاریخ نگاری ریاستی دستاویزات، سرکاری بیانیوں اور اشرافی تحریروں پر انحصار کرتی تھی، جبکہ سبالٹرن مورخین نے زبانی روایت، عوامی یادداشت، لوک ادب، عدالتی ریکارڈ اور مقامی داستانوں کو بھی معتبر تاریخی ذرائع کے طور پر استعمال کیا۔ اس طریقۂ کار نے تاریخ کو زیادہ جمہوری اور جامع بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

گیانندر پانڈے نے The Construction of Communalism in Colonial North India میں واضح کیا کہ نوآبادیاتی تاریخ نویسی نے مذہبی تقسیم کو ایک "فطری حقیقت" کے طور پر پیش کیا، حالانکہ یہ تقسیم استعماری اقتدار کی پیداوار تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> "Colonial historiography constructed communalism not as a byproduct but as an instrument of rule."(9)

یہ نکتہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ نوآبادیاتی طاقت نے صرف سیاسی غلبہ قائم نہیں کیا بلکہ مذہبی اور ثقافتی شناختوں کو بھی اپنے مفاد کے مطابق تشکیل دیا۔ سبالٹرن اسٹڈیز کی سب سے بڑی فکری کامیابی یہ ہے کہ اس نے "خاموشی" کو بھی ایک معنی خیز حقیقت کے طور پر دیکھا۔ خاموشی محض عدم موجودگی نہیں بلکہ طاقت کی پیدا کردہ ایک حکمتِ عملی ہے۔ جب کسی طبقے کی آواز مسلسل دبائی جائے تو اس کی خاموشی خود ایک سیاسی متن بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سبالٹرن اسٹڈیز صرف "گمشدہ آوازوں" کی بازیافت نہیں بلکہ علم، طاقت اور نمائندگی کے پورے نظام پر تنقید بھی ہے۔

سبالٹرن اسٹڈیز کے تناظر میں پاکستانی اردو افسانے اور ناول میں حاشیائی کرداروں کا مطالعہ محض ادبی تجزیہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی، سماجی اور سیاسی قرأت بھی ہے۔ برصغیر کی نوآبادیاتی تاریخ، طبقاتی تقسیم، ذات پات، صنفی ناہمواری، مذہبی اقلیتوں کی محرومیاں اور ریاستی طاقت کے جبر نے ایسے بے شمار کردار پیدا کیے جو مرکزی بیانیے سے خارج رہے۔ اردو ادب، خصوصاً پاکستانی اردو افسانہ، ان خاموش اور دبے ہوئے کرداروں کی آواز بن کر سامنے آیا۔ سبالٹرن اسٹڈیز بنیادی طور پر ان طبقات کی تاریخ اور شعور کو سامنے لانے کی کوشش ہے جنہیں روایتی تاریخ نگاری اور مقتدر بیانیوں نے نظر انداز کیا۔ رنجیت گہا، گایتری چکرورتی اسپیواک اور پارتھا چٹرجی جیسے مفکرین نے اس بات پر زور دیا کہ تاریخ ہمیشہ حکمران طبقے کی زبان میں لکھی گئی، جب کہ محکوم طبقات کی اپنی آواز کو دبا دیا گیا۔ اردو افسانہ اسی خاموشی کو متن میں تبدیل کرتا ہے اور ایسے کرداروں کو مرکز میں لاتا ہے جو معاشرے کے حاشیوں پر زندگی بسر کرتے ہیں۔

پاکستانی اردو افسانے میں حاشیائی کردار مختلف صورتوں میں سامنے آتے ہیں۔ یہ کردار کبھی کسان ہیں، کبھی مزدور، کبھی عورت، کبھی مذہبی اقلیت، کبھی جسم فروش، کبھی خواجہ سرا، کبھی مہاجر اور کبھی جنگ و دہشت گردی کے متاثرین۔ ان کرداروں کی زندگی سماجی طاقت کے غیر مساوی نظام کی علامت بن جاتی ہے۔ منٹو کے افسانوں میں تقسیم کے دوران دربدر ہونے والے انسان، انتظار حسین کے ہاں ہجرت کے کرب میں مبتلا افراد، عبداللہ حسین کے ناولوں میں نوآبادیاتی جبر کے شکار کسان اور خالدہ حسین کے افسانوں میں تنہائی اور داخلی شکست کا شکار عورتیں، سبالٹرن کرداروں کی مختلف جہتیں پیش کرتے ہیں۔

سبالٹرن اسٹڈیز کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ حاشیے پر موجود انسان صرف مظلوم نہیں بلکہ اپنی الگ شناخت، شعور اور مزاحمت بھی رکھتا ہے۔ یہی تصور اردو افسانے میں کئی اہم صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر منٹو کا کردار "سگندھی" سماج کے اخلاقی معیار کو چیلنج کرتا ہے۔ وہ محض ایک جسم فروش عورت نہیں بلکہ اس سماج کے منافقانہ رویوں کا استعارہ بن جاتی ہے جو عورت کے جسم سے لطف اندوز تو ہوتا ہے مگر اسے عزت دینے سے انکار کرتا ہے۔ اسی طرح "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کا بشن سنگھ تقسیم کے سیاسی بیانیے کے مقابل ایک ایسا سبالٹرن کردار ہے جو اپنی خاموش دیوانگی میں پوری ریاستی منطق کو رد کر دیتا ہے۔ اس کی بے سمتی دراصل نوآبادیاتی تقسیم کے جبر کی علامت بن جاتی ہے۔

سبالٹرن تنقید کا ایک اہم پہلو زبان اور بیانیے کا مسئلہ بھی ہے۔ گایتری اسپیواک نے سوال اٹھایا تھا کہ "کیا سبالٹرن بول سکتا ہے؟" اس سوال کا تعلق اس امر سے ہے کہ کیا محکوم طبقہ اپنی اصل آواز میں اظہار کر پاتا ہے یا اس کی آواز بھی بالادست طبقہ ہی تشکیل دیتا ہے۔ اردو افسانے میں کئی مصنفین نے اس مسئلے کو شعوری طور پر برتا۔ احمد ندیم قاسمی کے دیہی کردار اپنی مقامی زبان اور لہجے کے ذریعے شناخت حاصل کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کسان اور مزدور محض پس منظر نہیں بلکہ ایک مکمل سماجی شعور کے حامل انسان ہیں۔ "گنڈاسا" اور "کپاس کا پھول" جیسے افسانے دیہی زندگی کے ان پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں جو شہری اشرافیہ کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

پاکستانی اردو ناول میں بھی سبالٹرن کردار اہمیت رکھتے ہیں۔ عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" برطانوی نوآبادیاتی دور میں کسانوں، سپاہیوں اور عام انسانوں کی محرومیوں کو نمایاں کرتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار نعیم صرف ایک فرد نہیں بلکہ اس پورے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو سامراجی نظام میں اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔ اسی طرح قرۃ العین حیدر کے ہاں تہذیبی زوال اور ہجرت کے تجربے سے گزرنے والے کردار اپنی جڑوں سے کٹ جانے کے باعث ایک نئے حاشیے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعے تقسیم کے بعد وجود میں آنے والی نئی قومی شناخت کے بحران کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

عورت بطور سبالٹرن کردار اردو ادب میں ایک مستقل موضوع رہی ہے۔ عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ اور فہمیدہ ریاض نے عورت کے داخلی کرب، سماجی استحصال اور شناخت کے مسائل کو نہایت شدت سے بیان کیا۔ سبالٹرن اسٹڈیز کے تناظر میں عورت کی حیثیت دوہری محکومی کی حامل ہے؛ وہ طبقاتی اور صنفی دونوں سطحوں پر جبر کا شکار ہوتی ہے۔ "ٹیڑھی لکیر" میں عصمت چغتائی نے عورت کی نفسیاتی اور سماجی پیچیدگیوں کو اس انداز میں پیش کیا کہ عورت پہلی بار محض مظلوم نہیں بلکہ ایک سوال اٹھانے والی ہستی بن کر سامنے آئی۔ اسی طرح خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" میں تقسیم کے سیاسی بحران کے اندر عورت کی بے بسی اور خاموش مزاحمت دونوں نمایاں ہیں۔

معاصر پاکستانی اردو افسانے میں سبالٹرن کرداروں کی نئی جہات سامنے آئی ہیں۔ دہشت گردی، مذہبی انتہاپسندی، سرمایہ دارانہ نظام اور شہری عدم مساوات نے نئے حاشیے پیدا کیے ہیں۔ محمد حنیف، حسن منظر، نیلم احمد بشیر اور مشرف عالم ذوقی جیسے لکھنے والوں نے جدید شہری زندگی کے ان کرداروں کو موضوع بنایا ہے جو معاشی، ثقافتی اور سیاسی نظام کے ہاتھوں بے شناخت ہو چکے ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ نے قبائلی علاقوں، مہاجر آبادیوں اور مذہبی اقلیتوں کو جس بحران سے دوچار کیا، اردو افسانہ اس کا حساس ریکارڈ بن کر سامنے آیا۔ یہاں سبالٹرن کردار صرف مظلوم نہیں بلکہ عالمی طاقتوں، ریاستی پالیسیوں اور مذہبی بیانیوں کے درمیان پسنے والے انسان کی علامت بن جاتے ہیں۔

سبالٹرن تنقید کا تعلق صرف موضوع سے نہیں بلکہ متن کی ساخت سے بھی ہے۔ اردو افسانہ کئی بار روایتی بیانیہ توڑ کر حاشیے کی شکستہ اور منتشر زندگی کو متن کی ہیئت میں منتقل کرتا ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں میں اساطیری اور علامتی انداز، خالدہ حسین کے ہاں ابہام اور داخلی کرب، اور انور سجاد کے ہاں تجریدی اسلوب، سبالٹرن تجربے کی پیچیدگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ اسلوبیاتی تجربے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حاشیے کی زندگی کو سیدھے اور روایتی انداز میں بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کی حقیقت خود ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہے۔

پاکستانی اردو ادب میں مذہبی اقلیتوں کے کردار بھی سبالٹرن مطالعے کا اہم حصہ ہیں۔ تقسیم کے بعد بننے والی قومی شناخت میں کئی اقلیتیں غیر مرئی ہوتی گئیں۔ اردو افسانہ ان کی تنہائی اور خوف کو سامنے لاتا ہے۔ منشا یاد اور اسد محمد خان جیسے افسانہ نگاروں نے ایسے کردار تخلیق کیے جو سماجی تعصب کے باعث اپنی شناخت چھپانے پر مجبور ہیں۔ یہ کردار قومی بیانیے کے اندر موجود خاموش تضادات کو آشکار کرتے ہیں۔

سبالٹرن اسٹڈیز کے تناظر میں اردو ادب کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ حاشیے کے کردار ہمیشہ مکمل شکست خوردہ نہیں ہوتے۔ ان کے اندر مزاحمت کی ایک صورت موجود رہتی ہے۔ یہ مزاحمت کبھی خاموشی میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی طنز میں، کبھی یادداشت میں اور کبھی ثقافتی روایت کے تحفظ میں۔ اردو افسانے میں کئی کردار اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات، زبان، لباس، یادوں اور تعلقات کے ذریعے طاقت کے نظام کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔ یہی مزاحمت سبالٹرن شعور کی بنیاد بنتی ہے۔

اردو ادب میں سبالٹرن کرداروں کی پیشکش دراصل پاکستانی سماج کے طاقت کے ڈھانچے کو سمجھنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ ادب ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ریاست، مذہب، سرمایہ اور پدرشاہی نظام کس طرح انسانوں کو مرکز اور حاشیے میں تقسیم کرتے ہیں۔ اردو افسانہ اس تقسیم کو بے نقاب کرتا ہے اور ان انسانوں کی کہانی بیان کرتا ہے جو تاریخ کے سرکاری بیانیے میں جگہ نہیں پا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ سبالٹرن اسٹڈیز کے حوالے سے اردو ادب کا مطالعہ صرف ادبی سرگرمی نہیں بلکہ ایک فکری اور سیاسی عمل بھی بن جاتا ہے۔

پاکستانی اردو افسانے اور ناول میں حاشیائی کرداروں کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ادب سماج کے خاموش طبقات کی اجتماعی یادداشت محفوظ رکھنے کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ کردار اپنے دکھ، خوف، محرومی اور مزاحمت کے ذریعے اس سماج کی اصل تصویر سامنے لاتے ہیں جسے اکثر مقتدر طبقات چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سبالٹرن تنقید ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ ادب کو صرف جمالیاتی زاویے سے نہیں بلکہ طاقت، جبر اور مزاحمت کے تناظر میں بھی پڑھنا ضروری ہے۔ اردو ادب کی یہی جہت اسے معاصر عالمی تنقیدی مباحث سے جوڑتی ہے اور اسے ایک زندہ اور متحرک ادبی روایت بناتی ہے۔

References:

1.Gramsci, Antonio. Selections from the Prison Notebooks. Edited and translated by Quintin Hoare and Geoffrey Nowell Smith, International Publishers, 1971.P36.

2. Guha, Ranajit, editor. Subaltern Studies I: Writings on South Asian History and Society. Oxford University Press, 1982.P86.

3.Guha, Ranajit. Elementary Aspects of Peasant Insurgency in Colonial India. Oxford University Press, 1983.P53.

4. Ibid.p76.

5. Said, Edward W. Orientalism. New York:Pantheon Books, 1978.P87.

6. Spivak, Gayatri Chakravorty. “Can the Subaltern Speak?” Marxism and the Interpretation of Culture, edited by Cary Nelson and Lawrence Grossberg, University of Illinois Press, 1988, p. 271.

7.Ibid.P290.

8.Ibid.P296.

9. Pandey, Gyanendra. The Construction of Communalism in Colonial North India. Oxford University Press, 1990.P92.